سبق پِھر پڑھ

ماہنامہ
لاہور۔ پاکستان

جلد: 26 شمارہ: 03 جمادی الثانی 1439ھ مارچ 2018ء

اس شمارے میں

اقوامِ متحدہ کا منشور اسلامی نقطۂ نظر سے

(اشاعتِ خاص)

مقامِ اشاعت

چودھری رحمت علی پبلشر نے میٹرو پرنٹرز سے چھپوا کر
دار السلام واپڈا ٹاؤن لاہور سے شائع کیا

اقوام متحدہ کا منشور اسلامی نقطۂ نظر سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

... مولانا زاہد الراشدی

بعد الحمد و الصلوٰۃ

اقوام متحدہ کی طرف سے ایک بار پھر یہ تقاضا سامنے آیا ہے کہ پاکستان میں ناموس رسالت کے تحفظ کا قانون تبدیل کیا جائے۔ توہینِ رسالت پر سزا کا قانون، تحفظِ ختمِ نبوت کی قانونی دفعات، نافذ شدہ چند شرعی قوانین اور دستور کی اسلامی دفعات ایک عرصے سے بین الاقوامی دباؤ کی زد میں ہیں۔ اقوام متحدہ، امریکا، یورپی یونین اور ایمنسٹی انٹرنیشنل سمیت بہت سے عالمی ادارے ہمارے ان قوانین کو انسانی حقوق کے منافی قرار دے کر ان کی تبدیلی کا مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سال بھی 10 دسمبر کو دنیا بھر میں ”انسانی حقوق کا دن“ منایا گیا جو 10 دسمبر 1948ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی طرف سے انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹر کی منظوری کے حوالہ سے منایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی آف گجرات کے شعبہ قانون نے 12 دسمبر کو ایک سیمینار کا اہتمام کیا، جس میں محترمہ جسٹس (ر) ناصرہ جاوید اقبال صاحبہ بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئیں اور راقم الحروف نے بھی اس سے خطاب کیا۔ میں نے اپنی گفتگو کے دوران بطور خاص یہ عرض کیا کہ بڑے دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانی حقوق کے مروجہ عالمی قوانین اور اسلامی تعلیمات و قوانین کے حوالے سے وسیع تر مباحثہ و مکالمہ کا ماحول پیدا کریں۔ عالمی طاقتوں اور اداروں کو اسلامی قوانین و احکام کے بارے میں تحفظات ہیں، جبکہ ہمیں بھی مروجہ انسانی حقوق اور ان کی تعبیر و تشریح کے مغربی معیار پر اسی قسم کے تحفظات ہیں۔ ان تحفظات کا علمی و فکری ماحول میں دلیل و منطق کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے ورنہ کنفیوژن اور تصادم دونوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

اب سے کم و بیش چھ سال قبل عمرہ کے لیے حاضری کے موقع پر مکہ مکرمہ میں انسانی

حقوق کے چارٹر پر ایک سرسری تبصرہ قلمبند کرنے کا موقع ملا تھا، جو پرانے کاغذات میں سے گزشتہ روز اچانک دستیاب ہوا۔ اسے ابتدائی امور خواندگی کے طور پر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ارباب علم ودانش سے گزارش ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں اور نئی نسل کی صحیح راہنمائی کے لیے مؤثر کردار ادا کریں۔

مغرب میں انسانی حقوق کے حوالے سے جو تاریخ بیان کی جاتی ہے' اس کا آغاز ''میگنا کارٹا'' سے کیا جاتا ہے۔ 1216ء میں برطانیہ کے کنگ جان اور جاگیرداروں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا معاہدہ اس عنوان سے ہوا تھا' جس کا اصل مقصد تو بادشاہ اور جاگیرداروں کے مابین اختیارات اور حدود کار کی تقسیم کا تھا' لیکن اس میں عام لوگوں کا بھی کسی حد تک تذکرہ موجود تھا' اس لیے اسے انسانی حقوق کا آغاز تصور قرار دیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں ایک عرصے تک حکمرانی کا حق اور اس کے تمام اختیار تین طبقوں کے درمیان دائر رہے ہیں (۱) بادشاہ (۲) جاگیردار اور (۳) مذہبی قیادت۔ ان میں مختلف مراحل میں آپس میں کشمکش بھی رہی ہے' لیکن عام شہری اس تکون کے درمیان جو دراصل جبر اور ظالمانہ حاکمیت کی تکون تھی صدیوں تک پستے رہے ہیں' مغرب خود اس دور کو جبر وظلم اور تاریکی وجاہلیت کا دور کہتا ہے اور اس تکون سے نجات حاصل کرنے کے لیے مغربی دنیا کے عوام کو طویل جدوجہد اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ بہر حال ان حکمران طبقات کی باہمی کشمکش کے پس منظر میں کنگ جان اور جاگیرداروں کے درمیان حقوق و اختیارات کی باہمی تقسیم کے معاہدہ کو میگنا کارٹا کہا جاتا ہے اور مغربی دنیا اسے انسانی حقوق کی ابتدائی دستاویز قرار دیتی ہے جو 1216ء میں 15 جون کو طے پایا تھا۔

اس کے بعد 1684ء میں عوامی بغاوت کے نتیجے میں انقلابی فوج نے پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کا قانون پیش کیا اور 1689ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ''بل آف رائٹس'' کی منظوری دی جو اس سمت پیش رفت کا اہم مرحلہ تھا۔ ادھر امریکا میں تھامس جیفرسن نے 12 جولائی 1776ء کو برطانوی استعمار کے تسلط سے امریکا کی مکمل آزادی کا اعلان کیا اور 1789ء میں

امریکی کانگریس نے دستور میں ترامیم کے ذریعے عوامی حقوق کو دستور کا حصہ بنایا۔

فرانس میں زبردست عوامی جدوجہد اور بغاوت کے ذریعہ 1789ء کو جاگیرداری' بادشاہت اور ریاستی معاملات میں چرچ کی مداخلت کو مسترد کر کے قومی اسمبلی سے شہری حقوق کا قانون ''ڈیکلریشن آف رائٹس آف مین'' منظور کرایا اور پورے سیاسی اور معاشرتی نظام کی کایا پلٹ دی۔ اسے ''انقلاب فرانس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مغرب میں ظلم و جبر اور حقوق کے درمیان اسے حد فاصل قرار دیا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے ذریعے نہ صرف بادشاہت اور جاگیرداری کا مکمل خاتمہ ہو گیا بلکہ اقتدار میں مذہبی قیادت کی شرکت کی بھی نفی کر دی گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چرچ' پوپ اور مذہبی قیادت نے عوام پر بادشاہ اور جاگیرداروں کی طرف سے ہونے والے دوہرے مظالم اور شدید جبر و تشدد میں عوام کا ساتھ دیا تھا اور مذہب عملاً بادشاہت اور جاگیرداری کا پشت پناہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس لیے بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ ساتھ پوپ کی سیاسی قیادت کا بوریا بستر بھی لپیٹ دیا گیا اور نئے نظام میں ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا کہ مذہب اور چرچ کا تعلق انسان کے عقیدہ' عبادت اور اخلاقیات کے ساتھ رہے گا' جبکہ سیاسی و معاشرتی معاملات میں رائے دینے' راہنمائی کرنے اور مداخلت کرنے کا مذہب' پادری اور چرچ کو کوئی حق نہیں ہوگا۔ اسی کو آگے چل کر ''سیکولرازم'' سے تعبیر کیا گیا اور معیاری نظام قرار دے کر پوری دنیا سے اسے اختیار کرنے اور اس کی پابندی کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے میں یورپی ممالک یعنی برطانیہ اور جرمنی وغیرہ کے درمیان جنگ ہوئی' جس میں پوری دنیا بالواسطہ یا بلاواسطہ لپیٹ میں آ گئی' اس لیے اسے ''جنگِ عظیم اول'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں عالمِ اسلام کی نمائندہ حکومت ''خلافتِ عثمانیہ'' نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا' چنانچہ جرمنی کے ساتھ ساتھ وہ بھی شکست سے دوچار ہو گئی تھی اور نتیجے میں خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ جنگ عظیم اول میں لاکھوں انسانوں کے قتل ہو جانے کے بعد اقوام و ممالک کی ایک بین الاقوامی تنظیم ''لیگ آف نیشنز'' قائم کی گئی تھی' جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ

اقوام و ممالک کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو جنگ کی صورت اختیار نہ کرنے دی جائے اور بین الاقوامی فورم کے ذریعہ ان تنازعات کا حل نکال کر قوموں اور ملکوں کی باہمی جنگ کو روکا جائے، لیکن ”لیگ آف نیشنز“ اپنے اس مقصد میں ناکام ہوگئی اور بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کے درمیان پھر عالمی جنگ بپا ہوئی، جس میں جرمنی اور جاپان ایک طرف جبکہ برطانیہ، فرانس اور روس وغیرہ دوسری طرف تھے۔ اس جنگ نے پہلی جنگ سے زیادہ تباہی مچائی اور اس کے آخری مراحل میں امریکا نے اتحادیوں کی حمایت میں جنگ میں شریک ہوکر جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، جس پر جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوا۔

اس کے بعد 1945ء میں ایک اور بین الاقوامی تنظیم اقوامِ متحدہ (United Nations) کے نام سے وجود میں آئی جو اب تک نہ صرف قائم ہے بلکہ بین الاقوامی معاملات کا کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اقوام متحدہ کے تنظیمی اور پالیسی سازی کے اختیارات اور معاملات پر اجارہ داری کی وجہ سے اقوام متحدہ پر مغربی ممالک کی بالادستی قائم ہے اور اسے عام طور پر انہی کے حق میں استعمال کیا جاتا ہے اقوام متحدہ کی تنظیمی اور پالیسی سازی کے اختیارات اور معاملات پر اجارہ داری کی وجہ سے اقوام متحدہ کی تنظیمی صورت حال یہ ہے کہ اس کی ایک ”جنرل اسمبلی“ ہے جس میں تمام ممبر ممالک برابر کے رکن ہیں اور سال میں ایک بار تمام ممالک کے حکمران یا ان کے نمائندے جمع ہوکر عالمی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس کے نتیجے میں قراردادیں پاس ہوتی ہیں۔ لیکن ان قراردادوں کی حیثیت صرف سفارش کی ہوتی ہے ان کا نفاذ ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ جنرل اسمبلی کی سینکڑوں سفارشی قراردادیں اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی فائلوں میں دبی پڑی ہیں۔

اقوام متحدہ میں پالیسی سازی، فیصلوں اور ان کے نفاذ کی اصل قوت ”سلامتی کونسل“ ہے جس کے گیارہ ارکان میں سے پانچ ارکان (۱) امریکا (۲) برطانیہ (۳) فرانس (۴) روس اور

(۵) چین مستقل ممبر کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ چھ ارکان دنیا کے مختلف ممالک میں سے باری باری دو دو سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ یہ گیارہ رکنی سلامتی کونسل اقوام متحدہ کی اصل قوت اور اتھارٹی ہے لیکن ان میں سے پانچ مستقل ارکان کو حقِ استعداد (Veto Power) حاصل ہے کہ امریکا، روس، چین، برطانیہ اور فرانس میں سے کوئی ایک ملک بھی سلامتی کونسل کے کسی فیصلے کو مسترد کر دے تو وہ کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس طرح پوری دنیا کے نظام پر اقوام متحدہ کے نام سے اصل حکمرانی اور کنٹرول ان پانچ ممالک کا ہے اور یہ پانچ ممالک جس بات پر متفق ہو جائیں پوری دنیا کو وہ فیصلہ بہرحال تسلیم کرنا ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کا اصل مقصد قوموں اور ملکوں کے درمیان ہونے والے تنازعات کا حل تلاش کرنا اور جنگ کو روکنا تھا، لیکن دسمبر 1948ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا عالمگیر منشور منظور کر کے اور اس کی پابندی کو تمام ممالک و اقوام کے لیے لازم قرار دے کر دنیا کے سیاسی اور معاشرتی نظام میں راہ نمائی اور مداخلت کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کر لیا۔ اور اس کے بعد سے ممالک و اقوام کے درمیان جنگ کو روکنے کے ساتھ دنیا بھر کے ممالک کے سیاسی اور معاشرتی نظاموں کو کنٹرول کرنا بھی اقوام متحدہ کی ذمہ داری سمجھا جا رہا ہے اور اقوام متحدہ اس سلسلے میں مسلسل کردار ادا کر رہا ہے۔

اقوام متحدہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے اور اس کے تحت متفقہ طور پر یا اکثریت کے ساتھ طے ہونے والے فیصلے ’’بین الاقوامی معاہدات‘‘ کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن تاریخ اور سماج کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اپنے جن فیصلوں کو دنیا پر نافذ کرنا چاہتی ہے، وہ عملاً نافذ ہوتے ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنے والے ملکوں کو سزا دی جاتی ہے حتیٰ کہ خلاف ورزی کرنے والے ملکوں پر فوج کشی بھی کی جاتی ہے اور انہیں اقوام متحدہ کا فیصلہ تسلیم کرنے پر بزور مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لیے انسانی حقوق کا منشور اور اقوام متحدہ کے دیگر فیصلے صرف ’’معاہدات‘‘ نہیں، بلکہ عملاً ’’بین الاقوامی

قانون'' بن چکے ہیں اور خود اقوام متحدہ صرف بین الاقوامی تنظیم نہیں بلکہ عملاً ایک عالمی حکومت کا درجہ رکھتی ہے، جس کے ذریعہ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک عملاً پوری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کے اس عملی کردار کو سامنے رکھنا بالخصوص عالمِ اسلام کے ان حلقوں کے لیے انتہائی ضروری ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ، اسلامی معاشرے کے قیام اور خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لیے دنیا کے کسی بھی حصہ میں محنت کر رہے ہیں تا کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ اس سلسلے میں ان کا مقابلہ اصل میں کس قوت سے ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر ایسی جدوجہد کرنے والے حلقے اور طبقے اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ ہم اپنے ملک میں اپنے مقتدر حلقوں ئسے نفاذِ اسلام کا مطالبہ کر رہے ہیں یا ان سے نفاذِ اسلام کے لیے لڑ رہے ہیں، جبکہ حقیقی صورت حال یہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے کسی بھی حصے میں نفاذِ اسلام یا شریعت کے قوانین کی ترویج کی جدوجہد ہو، اس کا سامنا اصل میں ایک بین الاقوامی نظام سے ہے اور ایک مضبوط عالمی نیٹ ورک سے ہے، جو ساری دنیا میں ''انسانی حقوق کے منشور'' کے عنوان سے مغرب کا طے کردہ سیاسی اور معاشرتی نظام نافذ کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہے۔

عالم اسلام کے کم و بیش سبھی ممالک اقوامِ متحدہ کا حصہ ہیں اور اس کے معاملات میں شریک ہیں، لیکن عالمِ اسلام کے نظریاتی اور باشعور حلقوں کو دو حوالوں سے واضح طور پر تحفظات کا سامنا ہے۔ ایک یہ کہ اقوامِ متحدہ کی فیصلہ سازی اور فیصلوں کے نفاذ کی اتھارٹی میں عالمِ اسلام کی کوئی نمائندگی نہیں ہے اور مسلمانوں کا کوئی ملک بھی ان پانچ ممالک میں شامل نہیں ہے جنہیں فیصلے مسترد کر دینے اور معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا اختیار اور حق حاصل ہے۔ اس طرح اقوامِ متحدہ کے فیصلہ سازی اور فیصلوں کی تنفیذ کے معاملات سے عالمِ اسلام کلیۃً بے دخل ہے اور اس کا کردار دنیا کے ان پانچ بڑوں کے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے اور کرتے چلے جانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہمارا دوسرا تحفظ انسانی حقوق کے منشور کے حوالے سے ہے جو صرف مغربی ممالک کی باہمی کشمکش اور انقلاب فرانس کے پس منظر کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے، بلکہ اس کی بہت سی دفعات اسلامی شریعت کے احکام وقوانین سے متصادم ہیں۔ اور عملی صورت حال یہ ہے جس کی ہم آئندہ سطور میں وضاحت کریں گے کہ اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کو من وعن قبول کر لینے کی صورت میں مسلم ممالک اور حکومتوں کو قرآن وسنت کے بیسیوں احکام اور شریعتِ اسلامیہ کے سینکڑوں ضابطوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، جبکہ عالمِ اسلام کی صورت حال یہ ہے کہ مسلم ممالک کے حکمران طبقات خدانخواستہ اس کے لیے کسی درجہ میں تیار بھی ہوں، مگر مسلم عوام کی اکثریت دنیا کے کسی بھی خطے میں اس کے لیے تیار نہیں ہے اور گزشتہ نصف صدی کے دوران درجنوں مسلم ممالک کی رائے عامہ جمہوری وسیاسی ذرائع سے اس امر کا اظہار کر چکی ہے کہ قرآن وسنت کے احکام وقوانین اور ریاست وحکومت کے معاملات میں مذہب کے کردار سے دست بردار ہونے کے لیے وہ کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ عالمِ اسلام کو اقوامِ متحدہ کے فیصلہ سازی اور فیصلوں کے نفاذ کے نظام میں شریک کیا جائے اور انسانی حقوق کے منشور پر نظرِ ثانی کی جائے۔ اگر اس وقت عالمِ اسلام کی دیگر حکومتیں ان کا ساتھ دیتیں تو اس سلسلے میں مؤثر پیش رفت ہو سکتی تھی، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور موجودہ صورتِ حال میں اب بھی اس کا بظاہر کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔

دسمبر 1948ء میں جب اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا یہ منشور منظور کیا تھا، اس وقت دنیا میں مسلم ممالک کا کوئی عالمی فورم موجود نہیں تھا، خلافتِ عثمانیہ کا اس سے قبل خاتمہ ہو چکا تھا اور اس کی جگہ لینے کے کوئی عالمی فورم سامنے نہیں آیا تھا بلکہ اب تک یہی صورت حال ہے، دنیا کے بیشتر مسلم ممالک آزاد نہیں تھے اور کسی نہ کسی استعماری قوت کی نوآبادی شمار ہوتے تھے۔ اس طرح جنرل اسمبلی میں عالمِ اسلام کی مکمل نمائندگی موجود نہیں تھی، اس لیے یہ کہنا کہ اقوامِ

متحدہ کی تشکیل' اس کے نظام کے تعین اور اس کے معاہدات کی تدوین میں عالمِ اسلام برابر کا شریک ہے' درست نہیں ہے اور انصاف کی بات نہیں ہے۔ اس لیے آج بھی مسلم حکومتوں بالخصوص او آئی سی کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے فرائض کو محسوس کریں اور اقوامِ متحدہ کے تنظیمی ڈھانچے اور اس کے تحت ہونے والے بین الاقوامی معاہدات پر نظر ثانی کا مطالبہ کرتے ہوئے اسلام اور عالمِ اسلام کی صحیح نمائندگی کا فرض پورا کریں۔

اقوام متحدہ کے منشور کے دفعہ وار تجزیہ سے پہلے تمہید کے طور پر چند تحفظات کا اظہار ضروری ہے:

☆ اقوام متحدہ کے منشور میں مغربی دنیا کے تہذیبی' سیاسی اور مذہبی پس منظر کو بنیاد بنایا گیا ہے اور انقلابِ فرانس سے پہلے کی صورت حال اور جنگِ عظیم اول اور دوم کا باعث بننے والے اسباب کو سامنے رکھا گیا ہے۔ یہ مغربی دنیا کا پس منظر ضرور ہے' لیکن عالمِ اسلام کا پس منظر قطعی طور پر یہ نہیں ہے۔ عالمِ اسلام میں قانون کی حکمرانی' انسانی حقوق کی پاسداری اور معاشرتی انصاف کی فراہمی کی ایک شاندار تاریخ موجود ہے جسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور مغرب اپنے علاقائی پسِ منظر کے ردعمل میں جس معاشرتی اور تہذیبی نتیجے تک پہنچا ہے' اسے پوری دنیا میں اور خاص طور پر اس پس منظر سے قطعی مختلف ماضی رکھنے والے عالمِ اسلام پر مسلط کرنے کے درپے ہے جو انصاف کا تقاضا نہیں ہے۔

☆ مذہب اور مذہبی قیادت نے یورپی ممالک میں یقیناً بادشاہت اور جاگیرداری کی پشت پناہی کی ہے' لیکن عالمِ اسلام میں مذہبی قیادت علمی وفکری طور پر ہمیشہ آزاد رہی ہے اور حکمرانوں کے مظالم کے مقابلے میں عوام کے ساتھ رہی ہے' اس لیے جو سزا مغرب نے اپنے مذہب کے لیے تجویز کی ہے' اسے عالمِ اسلام اور دینِ اسلام پر چسپاں کرنا سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔

☆ مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق سے مراد اگر یہ ہے کہ ہر معاملہ میں ان کے ساتھ برابری کا معاملہ کیا جائے' جیسا کہ عام طور پر اس کی یہی تشریح کی جا رہی ہے' تو یہ نہ صرف یہ کہ نا

ممکن ہے بلکہ عقل' انصاف اور فطرت کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے کہ مرد اور عورت کی تخلیق اور جسمانی ڈھانچے میں فرق ہے' ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیات میں فرق ہے' ان کے فطری فرائض میں فرق ہے اور ان کی قوت کار میں فرق ہے۔ اس فرق کو نہ ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور اس فرق کی موجودگی میں ہر معاملہ میں برابری ممکن نہیں ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کے لیے بہت خوبصورت اور فطری اصول بیان فرمایا ہے ”وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ط وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ○“ (سورۃ البقرۃ: ۲۲۸) کہ عورتوں کے حقوق ان کی ذمہ داریوں کے حساب سے ہیں اور مردوں اور عورتوں کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم ان کی جسمانی تخلیق' ذہنی نفسیات' فطری فرائض اور قوت کار کے حساب سے ہوگی تو وہی تقسیم فطری ہوگی اور وہی دراصل مساویانہ ہوگی' اس سے ہٹ کر کوئی بھی معاملہ فطرت اور انصاف سے انحراف متصور ہوگا۔

☆ خاندان سوسائٹی کا ایک بنیادی یونٹ ہے جس کا وجود اور بقا سوسائٹی کی ضروریات سے ہے۔ خاندان میاں بیوی اور اولاد پر مشتمل ہوتا ہے اور ان چند افراد میں کسی ایک کا انتظامی سربراہ قرار پانا خاندان کی فطری ضرورت ہے جسے قرآن کریم نے وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ط سے تعبیر کیا ہے۔ خاندان ایک ادارہ ہے اور کسی بھی ادارے کا نظام صحیح چلانے کے لیے نظم و نسق ایک ہاتھ میں ہوگا تو معاملات صحیح چلیں گے اور اگر برابر کے اختیارات کے دو مینیجر کسی ادارے میں بٹھا دیے جائیں گے تو وہ کوئی بھی ادارہ ہو' تباہی کا شکار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظام صحیح طور پر چلنے کی بڑی وجہ بھی یہی بتائی ہے کہ نظام ایک ہاتھ میں ہے ”لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ط فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ (سورۃ الانبیاء: ۲۲) کہ اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں خراب ہو جاتے' سو اللہ عرش کا مالک ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ اگر خدائی اختیارات کی حامل کوئی شخصیت اور ذات بھی موجود ہوتی تو کائنات درہم برہم ہو جاتی' اسی طرح خاندان کا نظام صحیح طور پر چلانے کے لیے ضروری

ہے کہ منتظم ایک ہو۔ عورت کو اسلام نے مرد کی مشیرہ معاون بنایا ہے بلکہ جناب نبی اکرم ﷺ نے **”والمرۃ راعیۃ فی بیت زوجھا“** کہا ہے کہ گھر کے اندر کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے بارے میں مسئولہ اور ذمہ دار ہے لیکن ”اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ“ (سورۃ النساء: ۳۴) اور ”وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ“ (سورۃ البقرۃ: ۲۲۸) فرما کر گھر کا نظم طے کیا ہے کہ سنیارٹی اور انتظامی کنٹرول مرد کے ہاتھ میں ہے اور یہی فطرت اور نظم کا تقاضہ ہے۔

مغربی دنیا آج اپنے خاندانی نظام کے بکھر جانے سے پریشان ہے اور بہت سے مغربی دانشور اس پر الجھن اور پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ مغرب نے خاندانی نظام کی فطری درجہ بندی کا لحاظ نہیں رکھا اور مرد اور عورت کو یکساں اختیارات کا حامل قرار دے کر اپنے خاندانی نظام کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔

☆ تمہید میں انسانی حقوق کے اس منشور کو تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا ”مشترک معیار“ قرار دیا گیا ہے جو محل نظر ہے، اس لیے کہ جب یہ منشور ترتیب دیا جا رہا تھا تو انسانی آبادی کے ایک بڑے حصے میں معاشرتی کردار رکھنے والے مذاہب اور ثقافتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا، مغرب اگر اپنی سوسائٹی میں اپنے مذہب کے ظالمانہ کردار سے ناراض ہے تو اس مذہب سے انکار اس کا حق لیکن باقی مذاہب کے بارے میں اس قسم کا فیصلہ کرنا اس کا حق نہیں ہے، اس سلسلہ میں عالم اسلام کی پوزیشن ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، لیکن انسانی حقوق کے منشور کی تشکیل کے وقت چین بھی اس سے باہر تھا اور تائیوان کے ایک جزیرے کو چین قرار دے کر محض خانہ پری کی گئی تھی، اسی وجہ سے عوام جمہوریہ چین کو بھی جو دنیا کی انسانی آبادی کے کم و بیش ایک چوتھائی حصے پر مشتمل ہے، انسانی حقوق کے بارے میں مغربی دنیا کی تعبیرات و تشریحات پر مسلسل تحفظات رہتے ہیں۔

دنیا کی علاقائی تہذیبوں، ثقافتوں اور معاشرتی کردار رکھنے والے مذاہب کو نظر انداز کر کے تشکیل دیے جانے والے منشور کو تمام اقوام کے واسطے مشترکہ معیار قرار دیا جانا ان کی ثقافتوں اور مذاہب کی نفی کے مترادف ہے اور عالم اسلام کے لیے نہ یہ نفی قابل قبول ہے اور نہ ہی وہ اپنے دین و

مذہب کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہے۔ اس لیے ان زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر اس منشور پر نظر ثانی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

اقوام متحدہ کے منشور کا تجزیہ:

دفعہ نمبر ۱ تا ۳ سے ہمیں اصولی طور پر اتفاق ہے اور اسلامی تعلیمات بھی ان حوالوں سے اسی نوعیت کی چلی آ رہی ہیں، البتہ موجودہ حالات میں ان اصولوں کی تطبیق اور مغربی ممالک حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے عملی کردار کے بارے میں ہمیں تحفظات ہیں، مثلاً دفعہ میں انسانوں کے درمیان ''نسلی فرق'' کی نفی کی گئی ہے جبکہ نسلی امتیاز اور برتری کی بنیاد پر قائم کی جانے والی یہودی ریاست اسرائیل کی مکمل سرپرستی کی جا رہی ہے۔

دفعہ نمبر ۴ ''غلامی کے خاتمے'' کے بارے میں ہے، ہمیں اس سے بھی اختلاف نہیں اور عالمِ اسلام نے اسے عملاً قبول کر رکھا ہے۔ چنانچہ گزشتہ ایک صدی کے دوران دنیا بھر میں جہاں بھی شرعی بنیادوں پر ''جہاد'' کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں کسی کو غلام یا لونڈی نہیں بنایا گیا اور نہ ہی موجودہ وقت میں دنیا کے کسی بھی حصے میں جہاد کے عنوان سے جنگ لڑنے والے گروہ کسی کو غلام یا لونڈی بنا رہے ہیں، لیکن اسلام اور غلامی کے بارے میں چونکہ بین الاقوامی سطح پر کنفیوژن پایا جاتا ہے اس لیے اس حوالہ سے کچھ باتیں پیش کرنا ضروری ہیں۔ جاہلیت کے دور میں کسی کو غلام یا لونڈی بنانے کے عام طور پر تین طریقے ہوتے تھے: (۱) طاقتور لوگ کمزور لوگوں کو زبردستی پکڑ کر بیچ دیتے تھے اور وہ غلام تصور کیے جاتے تھے، جناب نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرامؓ حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ اسی طریقہ سے غلام بنے تھے۔ (۲) قرضے یا تاوان کے بوجھ تلے دبا ہوا شخص قرضہ ادا نہ کر سکنے کی پوزیشن میں خود کو قرض خواہ یا تاوان وصول کرنے والے کے حوالے کر دیتا تھا اور وہ اسے فروخت کر دیتا تھا۔ (۳) جنگوں میں قید ہو جانے والے افراد کو اجتماعی قید خانے میں ڈالنے کی بجائے غلام اور لونڈیاں بنا کر تقسیم کر دیا جاتا تھا اور وہ ان لوگوں کی ملکیت ہوتے تھے۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے پہلی دونوں صورتوں کو بیع الحر حرام فرما کر ممنوع قرار دے دیا تھا' اور اس ارشادِ گرامی کے بعد مسلم معاشرہ میں اس نوعیت کی غلامی کا وجود باقی نہیں رہا تھا' البتہ جنگوں میں قید ہونے والوں کی غلامی کو اسلام نے باقی رکھا لیکن قطعی حکم کے طور پر نہیں بلکہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۵ ذٰلِکَ ط (سورۃ محمد:۴) پھر یا تو اس کے بعد احسان کر دیا تاوان لے لو یہاں تک کہ لڑائی والے اپنے ہتھیار ڈال دیں۔ یہ فرما کر قرآنِ کریم نے جنگی قیدیوں کے بارے میں دو متبادل صورتیں بھی بیان فرمائی ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ "غلام بنانا" حکم نہیں بلکہ مختلف صورتوں میں بطور آپشن ایک صورت ہے جس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ قرآن کریم نے غلاموں کو آزاد کر دینے کی ترغیب دی ہے اور ان کے حقوق بھی متعین فرمائے ہیں اور انہیں بلا وجہ سزا دینے اور ان کی طاقت سے زیادہ کام لینے سے منع فرمایا ہے' حتیٰ کہ حضرت ابو مسعود انصاریؓ کو جناب نبی اکرم ﷺ نے صرف اس وجہ سے لونڈی کو آزاد کر دینے کا حکم دیا تھا کہ انہوں نے لونڈی کو تھپڑ مار دیا تھا۔ بہر حال غلامی کی یہ صورت حکم کے طور پر نہیں بلکہ آپشن کے طور پر باقی رکھی ہے جس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوتے تھے اور اس وقت کا عالمی عرف یہی تھا' اسی وجہ سے آج کے عالمی عرف کو قبول کرتے ہوئے عالم اسلام نے شرعی جنگوں میں کسی کو غلام یا لونڈی بنانے سے گریز کا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔

بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جو بات قرآن وسنت کے کسی قطعی اور صریح حکم سے متصادم ہو اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی معاملے میں کوئی متبادل صورت موجود ہے یا اجتہاد کے شرعی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئی صورت اختیار کی جا سکتی ہے تو بین الاقوامی معاہدے کی صورت میں اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ غلامی کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کی اس دفعہ کو جنیوا کنونشن کی صورت میں بین الاقوامی معاہدہ کو عالمِ اسلام نے اسی اصول کے تحت قبول کر رکھا ہے اور اس پر ملت اسلامیہ عمل بھی

کر رہی ہے۔

اس شق کے حوالہ سے ہم پر مغرب کا یہ اعتراض ہے کہ جب غلامی کے خاتمے کو عالم اسلام نے عملاً قبول کر لیا ہے تو پھر غلامی کے بارے میں قرآن کریم کی آیات، جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اور فقہ اسلامی کے ابواب کو دینی تعلیم کے نصاب میں پڑھایا کیوں جا رہا ہے اور انہیں نصاب سے خارج کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ قرآن وسنت کے احکام وقوانین ابدی ہیں، انہیں منسوخ کرنے کی کوئی اتھارٹی موجود نہیں ہے اور ہم نے غلامی کے بارے میں موجودہ بین الاقوامی معاہدات کو قرآن وسنت کے احکام وقوانین میں نسخ کی بنیاد پر نہیں بلکہ موجودہ حالات میں ان کی تطبیق کے حوالہ سے قبول کیا ہے اور یہ اسی وقت تک ہے جب تک موجودہ حالات اور عالمی عرف باقی ہے، یہ نسخ نہیں بلکہ تطبیق کی ایک عملی صورت ہے، آئندہ کسی دور میں اگر پہلے والے حالات اور عالمی عرف لوٹ آئے تو قرآن وسنت کے ان احکام وقوانین پر اسی طرح عمل ہوگا جیسا پہلے دور میں ہوتا رہا ہے۔

غلامی کے بارے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ آزاد انسانوں کو پکڑ کر بیچ دینا جسے ”بردہ فروشی“ کہا جاتا ہے، امریکا میں صدر ابراہام لنکن کے دور تک موجود رہا ہے۔ اس سے قبل افریقہ سے لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں جہازوں میں بھر کر لایا جاتا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیا جاتا تھا۔ امریکا کی سیاہ فام آبادی انہی غلاموں کی اولاد ہے، صدر ابراہام لنکن نے غلامی کے خاتمے کا قانون نافذ کیا، لیکن ان سیاہ فاموں کو اس کے بعد بھی گوروں کے برابر حقوق حاصل نہیں تھے، ووٹ کا حق انہیں 1964ء میں صدر جان ایف کینیڈی کے دور میں سیاہ فام لیڈر مارٹن لوتھر کنگ کی عوامی تحریک کے نتیجے میں دستوری طور پر دیا گیا، اس وقت تک وہ ووٹ کے حق سے محروم تھے۔

دفعہ نمبر 5 میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جائے گا یا سزا نہیں دی جائے گی جو ظالمانہ ہو جس میں جسمانی تشدد ہو اور جو گھٹیا سلوک ہو۔ اقوامِ متحدہ کے ادارے

اور بین الاقوامی لابیاں اس کی تشریح یہ کرتی ہیں کہ جسمانی تشدد ذہنی اذیت اور توہین و تذلیل والا سلوک کسی شخص کے ساتھ نہیں کیا جائے گا۔ سلوک کی حد تک یہ بات ہمارے لیے بھی قابلِ قبول ہے بلکہ یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کی ہدایت کی ہے لیکن اس دفعہ میں ”یا سزا نہیں دی جائے گی“ کہہ کر سزاؤں کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی بھی جرم میں دی جانے والی سزا کو جسمانی تشدد ذہنی اذیت اور توہین و تذلیل سے خالی ہونا چاہیے اور جس سزا میں ان میں سے کوئی بات پائی جاتی ہے‘ وہ انسانی حقوق کے منافی تصور ہوگی۔ معاشرتی جرائم کی اسلامی سزاؤں کو اسی وجہ سے انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جاتا ہے کہ ان میں قتل کرنے‘ سنگسار کرنے‘ ہاتھ پاؤں کاٹنے‘ قصاص میں جسمانی اعضاء قطع کرنے‘ کوڑے مارنے اور کھلے بندوں لوگوں کے سامنے سزا دینے کی صورتیں موجود ہیں‘ قرآن و سنت کی بیان کردہ ان سزاؤں کو نہ صرف انسانی حقوق کے منافی کہا جاتا ہے بلکہ نعوذ باللہ وحشیانہ‘ ظالمانہ اور غیر انسانی سزاؤں سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے موقف کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ سزائیں قرآنِ کریم نے از سرنو طے نہیں کیں بلکہ یہ ساری سزائیں تورات کی بیان کردہ سزائیں ہیں جو آج بھی دنیا میں پڑھی جانے والی بائبل میں اسی طرح موجود ہیں۔ قرآنِ کریم نے بعض اصلاحات کے ساتھ تورات کی ان سزاؤں کے تسلسل کو باقی رکھا ہے جبکہ دوسری بات یہ ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسانی معاشرہ میں جرائم کا خاتمہ سخت سزاؤں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آج سعودی عرب میں جرائم کی شرح کم بیان کی جاتی ہے‘ حتیٰ کہ حرمین شریفین میں مختلف رنگوں‘ نسلوں اور ثقافتوں کے لوگ ہر وقت جمع رہنے کے باوجود جرائم کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی وجہ حرمین شریفین کے تقدس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے عدالتی نظام کی وہ سخت سزائیں بھی ہیں جو اسلام کی شرعی سزائیں ہیں۔ اسی طرح دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے دور میں جرائم کا مکمل خاتمہ ہو گیا تھا‘ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ امارتِ اسلامی

افغانستان میں طالبان نے اسلام کی شرعی سزاؤں کو عملاً نافذ کر رکھا تھا، جن کی برکت سے جرائم کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

دفعہ 16 بطور خاص قابل توجہ ہے جس میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ بیان کیا گیا ہے۔ اس دفعہ پر غور کیا جائے تو درج ذیل باتیں زیادہ غور کی مستحق ہیں:

(۱) نکاح کا حق بالغ مردوں اور عورتوں کو ہے۔ گویا نابالغ لڑکے اور لڑکی کے نکاح کو تسلیم نہیں کیا گیا، اسی لیے کم وبیش ہر ملک میں نکاح کے لیے لڑکے اور لڑکی کی عمر مقرر ہے اور اس سے کم عمر میں نکاح کو قانوناً تسلیم نہیں کیا جاتا، مثلاً پاکستان میں نکاح کے لیے لڑکے کی عمر 18 سال اور لڑکی کی عمر 16 سال ہے۔ اس سے کم عمر میں اگر نکاح ہوا ہے تو وہ قابلِ سزا جرم تصور ہوتا ہے اور شکایت کرنے پر اس کے خلاف مقدمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں حدیث وفقہ کی کتابوں میں نکاح صغیر اور نکاح صغیرہ اور اس کے ساتھ ولایت کے جو احکام ہیں وہ سب موقوف ہو جاتے ہیں اور اگر اس کے ساتھ اس بات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو معاملہ اور زیادہ تعجب انگیز ہو جاتا ہے کہ مرد اور عورت باہمی رضامندی سے زنا کا ارتکاب کریں تو وہ آج کے عالم عرف میں جرم نہیں سمجھا جاتا، گویا مقررہ حد سے کم عمر کا لڑکا یا لڑکی زنا کریں تو جرم نہیں ہے اور اگر باقاعدہ نکاح کر لیں تو یہ جرم تصور ہوگا۔

(۲) مرد اور عورت کے باہمی نکاح میں رنگ، نسل، قومیت اور مذہب کو رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے، اس میں مذہب کے حوالہ سے ہمارا اختلاف موجود ہے، اس لیے کہ اسلام کسی مسلمان لڑکی کا نکاح غیر مسلم کے ساتھ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور مسلمان مرد کا نکاح بھی کسی غیر مسلم خاتون کے ساتھ شرعاً جائز نہیں، سوائے اس کے کہ لڑکی اہلِ کتاب میں سے ہو اور خدا اور رسول اور قیامت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بنیادی باتوں پر یقین رکھتی ہو۔

(۳) نکاح وغیرہ کے مسائل یعنی خاندانی زندگی کے احکام میں آج کے عالمی فلسفے کے ساتھ مسلمانوں کا ایک بڑا تنازع یہی ہے کہ انسانی حقوق کے منشور کی اس دفعہ کی رو سے یہ

تقاضا کیا جا رہا ہے کہ مسلمان اور غیر مسلموں کے باہمی نکاح کی اجازت دی جائے' مگر مسلمان علماء دنیا میں کسی بھی جگہ قرآن وسنت کے صریح احکام کی وجہ سے یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ خاص طور پر مغربی ممالک میں جب کوئی مسلمان لڑکی غیر مسلم مرد سے یا مسلمان مرد کسی غیر مسلم عورت سے نکاح کرتا ہے اور اس پر اعتراض کیا جاتا ہے تو وہاں کی عدالتیں اس اعتراض کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اس نکاح کو جائز قرار دے دیتی ہیں۔

(۴) نکاح کے دوران یعنی ازدواجی زندگی میں میاں بیوی کو بالکل برابر قرار دے کر خاندان کی سربراہی کے معاملے میں مرد کے حق کی نفی کی گئی ہے' جس کے بارے میں ہم تمہید کے ضمن میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی ہے کہ اسلام نے مرد کو گھر کا حاکم قرار دیا ہے بلکہ یہ گھر کے نظم کے حوالہ سے بھی غیر معقول بات ہے' اس لیے کہ کسی ایک کی انتظامی برتری کو تسلیم کیے بغیر گھر کا نظام چلنا اور اس کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے۔

نکاح کو فسخ کرنے کے بارے میں مرد اور عورت کے حق کو برابر قرار دیا گیا ہے' یہ بھی اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا' اس لیے کہ اسلام مرد کو براہ راست طلاق کا جو حق دیتا ہے وہ عورت کو حاصل نہیں ہے اور انسانی حقوق میں مرد اور عورت کی مساوات کے نام پر یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مرد کی طرح عورت کو طلاق کا برابر کا قانونی حق دے کر عورت اور مرد کے درمیان مساوات قائم کی جائے۔

اسلام نے عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا لیکن مطالبہ طلاق کا حق دیا ہے جسے خلع کہا جاتا ہے اور اس مطالبہ حق کو پورا کرنا صرف خاوند پر موقوف نہیں ہے بلکہ اگر عورت کا مطالبہ جائز ہے اور مطالبہ کی وجوہ درست ہیں تو خاوند کے علاوہ تحکیم اور قضا کی صورت میں عورت کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے متبادل راستے موجود ہیں' کیونکہ حکم اور قاضی عورت کا مطالبہ درست ہونے کی صورت میں خاوند کی مرضی کے بغیر بھی نکاح کو فسخ کر سکتے ہیں' اس لیے اسلامی قانون کے بارے میں یہ تاثر درست نہیں ہے کہ اس میں عورت کو مکمل طور پر مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے'

البتہ یہ بات درست ہے کہ اسلام نے مرد کو براہ راست طلاق کا حق دیا ہے لیکن عورت کو یہ حق بالواسطہ دیا ہے جو مرد اور عورت کی نفسیات میں فطری فرق کے باعث معقول اور منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ خاندان کی بقا اور تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے۔

اس سلسلے میں عجیب بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے مذکورہ فلسفے کے اس مطالبے کو پورا کرنے کے لیے صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں پاکستان میں جو عائلی قوانین نافذ کیے گئے، ان میں نکاح کے فارم میں ''تفویض طلاق'' کا ایک مستقل خانہ درج کر کے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ایک درمیانی صورت تھی کہ خاوند کا بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دینا شرعاً بھی درست ہے اور اس سے مغرب کو بھی کسی حد تک مطمئن کیا جا سکتا ہے لیکن یہ خانہ عملاً غیر موثر ثابت ہوا ہے، اس لیے کہ اکثر و بیشتر نکاحوں میں اس خانہ کی طرف توجہ ہی نہیں دی جاتی اور نہ ہی فارم میں کسی نکاح کے اندراج کے موقع پر اس سوال کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے، اس لیے مغرب کا یہ دباؤ اور مطالبہ پھر زور پکڑ گیا ہے کہ عورت کو قانون میں صراحت کے ساتھ مرد کے برابر طلاق کا حق دیا جائے۔ اس کا حل ہمارے ہاں اب یہ سامنے لایا گیا ہے کہ بعض عدالتی فیصلوں میں خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا گیا ہے اور خلع کے قانونی طریق کار کے لیے سپریم کورٹ کے ایک سابق جج کی سربراہی میں قائم کیے جانے والے ''خواتین حقوق کمیشن'' نے اس سلسلے میں نئے قانون کے نفاذ کے لیے جو سفارشات پیش کی ہیں، ان میں خلع کو عورت کے مساوی حق طلاق کا درجہ دیا گیا ہے۔

بہرحال خاندانی قوانین کے حوالے سے مغربی فلسفہ اور اسلامی تعلیمات کے درمیان یہ ایک بنیادی تنازع ہے جو انسانی حقوق منشور کی اس دفعہ کی بنیاد پر کھڑا ہوا ہے اور مسلسل جاری ہے۔ اس کے ساتھ ہی عورت اور مرد میں مکمل مساوات کے حوالہ سے ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ مرد اور عورت کے بارے میں قوانین، احکام اور معاشرتی روایات کے فرق کو ''جنس کی بنیاد پر امتیاز'' قرار دیا جاتا ہے اور جنس کی بنیاد پر امتیازی قوانین کے مکمل خاتمے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ حکم، قانون اور ضابطے کے باب میں مرد اور عورت کے سلسلہ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے اور جہاں بھی کوئی فرق موجود ہے، اسے امتیازی قانون یا امتیازی رویہ قرار دے کر اس کے خاتمے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں بات کو سمجھنے کے لیے ان چند پہلوؤں پر نظر ڈال لی جائے تو ''امتیازی قوانین'' کے خاتمے کا یہ موقف مزید واضح ہو جاتا ہے:

☆ اسلام میں عورت کو حکمرانی کے حق سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

☆ وراثت کے حصول میں مردوں اور عورتوں کو بیشتر صورتوں میں برابر کا حق نہیں دیا گیا۔

اور اس قسم کے اور بہت سے امور ہیں جہاں قرآن وسنت نے مرد اور عورت کے لیے الگ الگ احکام وقوانین بیان کیے ہیں۔ یہ سب صورتیں مغرب کی نظر میں مرد اور عورت میں مساوات کے مبینہ اصول کے منافی ہیں اور امتیازی قانون یا رویہ کہلاتی ہیں۔

ہم نے ان سطور میں صرف اس فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد اور عورت میں مکمل مساوات کے قیام اور امتیازی قوانین کے خاتمہ کے لیے قرآن وسنت کے کون کون سے احکام میں خدانخواستہ رد وبدل کرنا ضروری ہو جاتا ہے، ہم اس حوالہ سے دلائل کی بحث میں نہیں پڑتے اگر کوئی صاحب علم ودانش دلائل اور منطق کے ساتھ اس بحث کی طرف توجہ دے سکیں تو یہ ان کی بڑی دینی خدمت ہوگی۔ البتہ تفصیلات میں جائے بغیر صرف ایک اصولی بات کی طرف متوجہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی جگہ ایک فورم میں راقم الحروف سے سوال کیا گیا کہ کیا مرد اور عورت کے بارے احکام وقوانین میں فرق ہونا چاہیے؟ میں نے عرض کیا کہ کیا مرد اور عورت میں کوئی فرق موجود ہے؟ سوال کرنے والے نے جواب دیا کہ یہ فرق تو ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر مرد اور عورت کی تخلیق میں، جسمانی ساخت میں، ذہنی رجحانات میں، نفسیات میں، قوت کار میں، فطری فرائض میں اور طرز عمل میں فرق موجود ہے جسے کسی طرح بھی ختم نہیں کیا جا سکتا تو ان کے بارے میں احکام وقوانین کا فرق بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر سوسائٹی کے نظام کو اور

خاص طور پر خاندانی سسٹم کو صحیح طور پر نہیں چلایا جاسکتا۔

دفعہ نمبر 81 اور دفعہ نمبر 91 پر تفصیل کے ساتھ گفتگو ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان دو دفعات پر عالمِ اسلام اور مغرب کے درمیان دو بڑے تنازعات کی بنیاد ہے۔ ایک جھگڑا آزادیٔ رائے ہے۔ آزادیٔ مذہب اور آزادیٔ رائے کی حدود کیا ہیں اور ان کے بارے میں آج کی دنیا کے ساتھ ہم مسلمانوں کا تنازع کیا ہے؟ اس کی عملی صورتیں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور توہینِ رسالت پر موت کی سزا کے قانون کے حوالہ سے ہے جو ایک عرصہ سے جاری ہے۔ چنانچہ موجودہ عالمی کشمکش اور مباحثہ کو اس کے اصل تناظر میں سمجھنا بہت ضروری ہے۔

مغرب چونکہ ریاستی، حکومتی اور معاشرتی معاملات میں مذہب کے کردار سے دست بردار ہو چکا ہے اور اس کے نزدیک مذہب صرف فرد کی ذاتی رائے اور ترجیح کا معاملہ ہے، اس لیے اس کا خیال ہے کہ ریاست اور حکومت کو مذہبی معاملات میں فریق نہیں بننا چاہیے۔ یہ فرد کا ذاتی حق ہے کہ وہ کوئی عقیدہ رکھے یا نہ رکھے، کسی کی عبادت کرے یا نہ کرے، ایک مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لے، اپنے مذہب کا کھلم کھلا پرچار کرے۔ دوسروں کو اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دے اور اپنے مذہبی رسوم آزادی کے ساتھ ادا کرے۔ اس کے اس حق میں مداخلت کا حکومت یا ریاست کو حق حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح ریاست و حکومت کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ مذہب کے حوالہ سے اپنے شہریوں کے درمیان کوئی فرق روا رکھے اور مختلف مذاہب کے لوگوں کے لیے الگ الگ قانون اور احکام نافذ کرے۔ اگر حکومت کسی فرد یا گروہ کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتی ہے تو اسے مذہبی آزادی میں مداخلت قرار دیا جاتا ہے اور اگر مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں الگ الگ احکام و قوانین کا نفاذ کرتی ہے تو اسے مذہبی امتیاز کا قانون کہا جاتا ہے اور اسے ختم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ دفعہ نمبر 81 میں مذہبی آزادی کی جو حدود بیان کی گئی ہیں، ان کی بنیاد پر ہمارے ہاں پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی دستوری دفعہ اور انہیں اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ سے روکنے والے امتناع قادیانیت

قانون کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اسے ختم کرنے کا عالمی سطح پر مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح بعض دوسری اقلیتیں بالخصوص مسیحی آبادی بھی بعض ملکی قوانین کو مذہبی آزادی کے منافی اور مذہبی امتیاز پر مبنی قوانین قرار دے کر ان کے خاتمہ کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔

جبکہ اس سلسلہ میں اصل صورت حال یہ ہے کہ پاکستان اپنے وجود اور دستور دونوں حوالوں سے ایک نظریاتی اسلامی ریاست ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حدود میں اس نظریہ و مذہب کا نہ صرف تحفظ کرے بلکہ اس کے احکام و قوانین کا نفاذ عمل میں لائے اور ملک میں ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کرے۔ اس لیے اسلامی عقیدہ ثقافت کی حفاظت اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری حکومت پاکستان کا ریاستی فریضہ قرار پاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بھی ملک کی حکومت کا یہ اولین فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دستور کا تحفظ کرے' اس کا نفاذ کرے اور اس کے منافی کوئی کام اپنے ملک میں نہ ہونے دے۔ کسی بھی ملک کے دستور کی بنیادوں اور اصولوں سے اتفاق یا اختلاف ایک الگ امر ہے لیکن ملک کے اندر اس کے تحفظ و نفاذ کا معاملہ اس سے مختلف امر ہے۔ مثلاً فرانس کے دستور کی بہت سی باتوں سے خود اس ملک کے بہت سے شہریوں کو نظری طور پر اختلاف ہوگا لیکن ملک کے شہری کی حیثیت سے اس اختلاف کے باوجود اس دستور کو ماننا اور اس پر عمل کرانا حکومت کا فرض ہے۔ اگر وہ اختلاف کی بنیاد پر ملک کے دستور کی کسی بات پر عمل کرنے سے انکار کرے گا تو یہ اختلاف نہیں رہے گا بلکہ بغاوت کی شکل اختیار کر لے گا جس کی اجازت دنیا کا کوئی ملک یا حکومت دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

پاکستان جب دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوؤں سے الگ معاشرت و ثقافت کے حوالہ سے تشکیل پایا تھا اور جب اس کا دستور اسلامی بنیادوں پر طے کیا گیا تھا' ان دونوں مواقع پر اس خطہ میں موجود غیر مسلم اقلیتیں اس عمل میں شریک تھیں اور انہوں نے اسلام کی بنیاد پر پاکستان کی تشکیل اور نظریاتی بنیادوں پر دستوری تدوین کے عمل کو تسلیم کیا تھا جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی

حدود میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سوشل کنٹریکٹ اور سماجی معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے اور جب اقوام متحدہ نے پاکستان کی اس امتیازی حیثیت کے باوجود اس کی رکنیت کو قبول کر رکھا ہے اور پاکستان اپنے اسلامی تشخص اور نظریاتی دستور کی موجودگی میں اقوام متحدہ کا سرگرم رکن ہے تو گویا عالمی سطح پر بھی پاکستان کے اس امتیازی تشخص کو قبول کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ تحریکِ پاکستان اور دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے دونوں مواقع پر پاکستان کے اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کا فیصلہ ملک کے عوام پر جبر کے ذریعہ مسلط نہیں کیا گیا بلکہ آزادانہ عوامی رائے اور مکمل جمہوری عمل کی صورت میں عوام کے منتخب نمائندوں نے یہ فیصلے کیے ہیں۔ تو ان زمینی حقائق کی موجودگی میں دنیا میں کسی بھی سطح پر کسی کا یہ حق نہیں رہ جاتا کہ وہ پاکستان کے اس اسلامی نظریاتی تشخص سے انکار کرے اور ملک کے اندر اس اسلامی نظریاتی تشخص کے لیے کیے جانے والے ریاستی اور حکومتی اقدامات میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

اس اصولی گزارش کے بعد ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ پاکستان میں اپنے دستوری مذہب اسلام کی حفاظت و ترویج اسی طرح ریاست و حکومت کی ذمہ داری ہے جس طرح امریکا میں امریکی دستور کی حفاظت و تنفیذ وہاں کی حکومت و ریاست کی ذمہ داری ہے، جس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ملک میں رہنے والے تمام غیر مسلموں کو یہ حق تو ہے کہ وہ اپنا نظری اختلاف قائم رکھتے ہوئے ملک میں رہیں اور دستور میں اتفاق رائے اور سماجی معاہدہ کی رو سے طے پانے والے اپنے حقوق سے مکمل استفادہ کریں، لیکن اس اختلاف کی بنیاد پر پاکستان کے اسلامی تشخص اور دستور کی اسلامی بنیادوں کو چیلنج کرنے کا حق انہیں کسی طرح بھی حاصل نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں قادیانیوں کا موقف اور طرز عمل سب سے زیادہ تعجب انگیز بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ وہ عالم اسلام کے اجماعی فیصلے کو ماننے سے انکاری ہیں، پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے دستوری فیصلے سے منحرف ہیں، ملک کی سپریم کورٹ کے متفقہ فیصلے کو تسلیم نہیں کر رہے اور پاکستان

کے شہریوں کے جمہوری فیصلے سے انحراف کر رہے ہیں، اور اس سب کچھ کے ساتھ ان کا اصرار ہے کہ پوری امتِ مسلمہ اور ساری کی ساری پاکستانی قوم ان کے سامنے سرنڈر ہو اور تمام جمہوری، عدالتی اور دینی فیصلوں سے دست بردار ہو کر ان کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں مسلمان کے طور پر اپنے وجود کا حصہ تسلیم کرے۔ آج قادیانی گروہ دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے کہ پاکستان میں ان کے انسانی حقوق اور مذہبی آزادی پامال کی جا رہی ہے اور وہ مظلوم ہیں جبکہ بین الاقوامی ادارے اور مغربی ممالک حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمارا موقف بالکل واضح ہے کہ مسئلہ قادیانیوں کے مذہبی یا شہری حقوق کا نہیں بلکہ ان کے معاشرتی سٹیٹس اور حقوق کے ٹائٹل کا ہے، وہ اگر اپنے بارے میں دستوری، عدالتی اور شرعی فیصلوں کو قبول کر کے مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں تو ملک کی دیگر غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ ان کے تمام حقوق محفوظ ہیں اور ان کے کسی مسلمہ حق سے انکار نہیں، لیکن اگر وہ جمہوری اور دینی فیصلوں کو مسترد کرتے ہوئے دستور و قانون کو چیلنج کرتے ہیں اور مسلم اکثریت کا زبردستی حصہ بننا چاہتے ہیں تو اس کا سرے سے کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

دفعہ 19 میں آزادی رائے کی بات کی گئی ہے اور اس کی بنیاد پر کہا جا رہا ہے کہ مذہب اور مذہبی شخصیات سے اختلافات اور ان پر تنقید بھی آزادی رائے کا حصہ ہے اور اس کو جرم قرار دے کر اس پر موت کی سزا مقرر کرنا آزادی رائے اور آزادی ضمیر کے انسانی حق کے منافی ہے۔ یہ بات مغالطے کے سوا کچھ نہیں، اس لیے کہ اختلاف رائے اور چیز ہے اور توہین اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ مسلمانوں نے علمی اختلاف کا جواب ہمیشہ علمی انداز سے دیا ہے، صدیوں سے مستشرقین اسلام پر، قرآنِ کریم پر اور جناب نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اور کردار پر اعتراضات کر رہے ہیں اور مسلمان دانشور ان کے جوابات دے رہے ہیں، لیکن جناب نبی اکرم ﷺ یا کسی بھی سچے رسول

اور نبی کی توہین کو انہوں نے کبھی برداشت نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کبھی یہ بات برداشت ہو سکتی ہے۔

میں اس کی دو واقعاتی مثالیں دینا چاہوں گا۔ مغرب کے ایک دانشور سر ولیم میور نے جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر کتاب لکھی اور اس میں بعض اعتراضات کیے، ان میں اعتراضات کا مسلمانوں کی طرف سے کتاب کی صورت میں جواب دیا گیا، لیکن سلمان رشدی نے "شیطانی آیات" کے نام سے خرافات کا مجموعہ مرتب کیا جس کی بنیاد علمی یا تاریخی اشکالات پر نہیں بلکہ توہین واستخفاف اور طنز واستہزاء پر تھی، اس لیے اسے برداشت نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اب سے ڈیڑھ سو سال قبل لاہور میں ایک ہندو دانش ور پنڈت دیانند سرسوتی نے "ستیارتھ پرکاش" کے نام سے کتاب لکھی اور اس کے ایک باب میں قرآنِ کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں سو سے زیادہ اعتراضات کیے، مسلمان علماء نے اس کتاب کا جواب لکھا اور پنڈت سرسوتی سے براہِ راست مباحثہ کر کے اسے لاجواب کیا، لیکن لاہور میں ہی ایک اور ہندو مصنف راج پال نے "رنگیلا رسول" کے نام سے کتاب لکھی جس کا نام ہی توہین آمیز تھا، اسے برداشت نہیں کیا گیا اور غازی علم دین شہید نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اختلاف اور توہین میں فرق ہے اور توہین رسالت کو جرم قرار دینے پر اعتراض در حقیقت توہین کو حقوق میں شامل کرنے کی بات ہے جو قطعی طور پر غیر معقول اور ناقابل قبول ہے۔ میں عام طور پر یہ عرض کیا کرتا کہ دنیا کے ہر ملک میں "ہتک عزت" پر قانونی چارہ جوئی کا حق شہریوں کو حاصل ہے اور "ازالہ حیثیت عرفی" سے شہریوں کو قانونی تحفظ دیا جاتا ہے۔ اگر کسی ملک کے ایک عام شہری کی ہتک عزت اور ازالہ حیثیت عرفی جرم ہے تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہتک عزت اس سے کئی گنا زیادہ سنگین جرم ہے، اس لیے کہ اس کے ساتھ پیغمبر خدا ﷺ کے کروڑوں عقیدت مندوں کے دلی جذبات کی توہین بھی شامل ہو جاتی ہے۔

"آزادیٔ رائے" کے حوالے سے ایک اور بات بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ کم

وبیش ہر ملک میں اس کی نظریاتی اساس، اس کے دستور اور قومی شخصیات کی توہین کا کسی کو حق نہیں دیا جاتا، حتیٰ کہ قومی شعائر مثلاً پرچم وغیرہ کی حرمت کے قانونی تحفظ کا اہتمام کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ فوج کی وردی، پولیس کی وردی اور ان کے اسٹارز وغیرہ کو بھی قومی شعبوں کی علامات قرار دے کر ان کی توہین کو جرم سمجھا جاتا ہے، اسی طرح اسلام بھی چونکہ ایک اسلامی ریاست کی دستوری اساس ہے، اس لیے اسلام کے شعائر اور دینی علامات کی توہین بھی جرم ہے اور انسانی حقوق کے نام سے ان شعائر اور علامات کی بے حرمتی کا جواز فراہم کرنا انصاف اور عقل کے خلاف بات ہے۔

ہمارا مغرب سے مطالبہ ہے کہ اختلاف اور توہین کے فرق کو تسلیم کیا جائے اور جس طرح کسی بھی ملک کی قومی شخصیات اور قومی علامات کی حرمت وعزت کو قانونی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے، اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام، مسلمہ مذاہب اور ان کی علامات وشعائر کے قانونی تحفظ کا حق تسلیم کیا جائے۔

دفعہ نمبر 20 کے بارے میں بھی کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اس لیے کہ معاشرے کی سیاسی گروہ بندی جناب نبی اکرم ﷺ کے دور میں بھی موجود تھی جو پہلے قبائل کی صورت میں تھی، جیسا کہ قریش میں سیاسی معاملات کی انجام دہی مختلف شعبوں میں مختلف خاندانوں کے سپرد تھی جبکہ جناب نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت مہاجرین، انصار اور خاندان نبوت کے الگ الگ سیاسی موقف کی شکل میں اس کا اظہار ہوا، انصار مدینہ نے اپنے طور پر خلیفہ کا انتخاب کرنا چاہا، مہاجرین نے ان سے اختلاف کیا اور حضرت علیؓ نے خاندانِ نبوت کی طرف سے مہاجرین اور انصار کے فیصلہ پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا، جس کی تفصیلات میں جائے بغیر اصولی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اجتماعی وسیاسی مسائل پر الگ الگ گروہوں کی صورت میں موقف اختیار کرنے اور کے لیے جدوجہد کرنے کی عملی شکل اس دور کے اسلامی معاشرہ میں موجود تھی، اسی کی ترقی یافتہ صورت کو اگر جماعت سازی کی بنیاد سمجھ لیا جائے تو ہمیں اس میں کوئی اشکال نظر نہیں

آتا، البتہ اس انجمن سازی کا بنیادی اصول "سورۃ المائدہ: ۲" کے قرآنی ارشاد کو قرار دے کر جماعت سازی کی حدود وشرائط کا تعین ضروری ہوگا۔

دفعہ نمبر 21 سیاسی نظام کے بارے میں ہے جس کے تحت اقوامِ متحدہ کے رکن ممالک نے عالمی سطح پر اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے کہ ان کا سیاسی نظام اور حکومتی شہریوں کی اجتماعی رائے کے تابع ہوگا اور عوام کی رائے سے ہٹ کر قائم ہونے والی کوئی حکومت اس منشور کی رو سے جائز حکومت متصور نہیں ہوگی۔ اسے جمہوریت کہا جاتا ہے اور عوام کی حاکمیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس حوالہ سے اسلامی تعلیمات، قرآن وسنت کے ارشادات اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کی روشنی میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری ہے:

☆ اسلام میں عوام کی حاکمیت کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی پابندی ایک اسلامی حکومت کی بنیاد ہے اور حکمران فرد یا گروہ عوام کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی بجائے قرآن وسنت کے احکام کو نافذ کرنے کا پابند ہے، اس لیے اسلام کے سیاسی نظام میں نظامِ حکومت کو حکومت کی بجائے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ حکمران اَز خود حکومت نہیں کرتا بلکہ قرآن وسنت کے احکام کے نفاذ میں جناب نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتا ہے، چنانچہ فقہائے امت نے خلافت کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ خلیفہ وہ ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے امت مسلمہ کے اجتماعی معاملات سرانجام دے۔

☆ اسلام میں عوام یا ان کے نمائندوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ قرآن وسنت کے صریح اور قطعی احکام میں کوئی ردو بدل کریں، ان کی پابندی ہر حال میں حکمران، عوام اور انکے نمائندوں پر ضروری ہے، مگر وہ احکام ومسائل جو قرآن وسنت میں موجود نہیں ہیں، یا واضح نہیں ہیں، یا ان کی تعبیر وتشریح میں امت کے اہل علم کی آراء مختلف چلی آرہی ہیں، ان میں اجتہاد کے شرعی اصولوں کے دائرے میں حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔ البتہ ان میں یہ فرق ضروری ہے کہ جن امور ومسائل کا تعلق عوامی اور انتظامی معاملات سے ہے ان کا

فیصلہ کرنا حکومت یا عوام کے نمائندوں کا حق ہے اور جن مسائل کا تعلق شرعی امور اور دینی تعبیر و تشریح سے ہے ان میں مسلمہ اہل علم فیصلے کی اتھارٹی ہوں گے اور انہی کے فیصلے معتبر ہوں گے۔

☆ اسلام میں حکومت کی تشکیل اور خلیفہ کا انتخاب عوام کی رائے پر ہوگا جیسا کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے جانشین کا انتخاب عوامی بحث و مباحثہ کے بعد عوامی رائے اور انتخاب کے ذریعہ ہوا' اپنا جانشین جناب نبی اکرم ﷺ نے خود نامزد نہیں فرمایا' البتہ ارشادات ضرور کیے تھے لیکن فیصلہ مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا تھا۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر اپنا جانشین نامزد کرنے اور اس کے لیے تحریر لکھوانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ فرما کر یہ ارادہ ترک کر دیا کہ ''اللہ تعالیٰ ابوبکر کے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بننے دیں گے اور مسلمان بھی کسی اور کو قبول نہیں کریں گے۔'' یہ ارشادِ گرامی جہاں حضرت ابوبکر کے خلیفہ رسول ہونے کی اہلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں مسلمانوں کی اجتماعی رائے کی اصابت پر اعتماد کا اظہار بھی ہے' چنانچہ عملاً یہی ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد اس مسئلے پر اختلاف تو ہوا لیکن بالآخر امت حضرت ابوبکر صدیقؓ پر متفق ہو گئی۔

فقہائے اسلام نے خلافت کے انعقاد یعنی ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کی جو صورتیں بیان فرمائی ہیں' ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے' کم و بیش سبھی فقہاء نے اس کی پانچ صورتیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) عامۃ المسلمین یا ان کے اہل حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا چناؤ کیا گیا تھا' اسے آج کے دور میں براہِ راست انتخاب یا بالواسطہ انتخاب کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۲) خلیفۃ المسلمین اپنا جانشین خود نامزد کردے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کر دیا تھا۔

(۳) خلیفہ وقت کسی ایک فرد کو جانشین بنانے کی بجائے خلافت کے اہل لوگوں کا ایک پینل

نامزد کر دے اور ان میں سے کسی کو منتخب کیا جائے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے چھ بزرگوں کا پینل نامزد کر دیا تھا اور ان میں سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں جو اس پینل میں شامل تھے اور جنہیں اس پینل نے خلیفہ کے چناؤ کا اختیار دے دیا تھا' ان کا ارشاد ہے کہ وہ مسلسل تین دن تک اس سلسلہ میں لوگوں سے مشاورت کرتے رہے' انہوں نے مدینہ منورہ کا کوئی طبقہ اور حلقہ نہیں چھوڑا جس سے مشاورت نہ کی ہو' حتیٰ کہ انہوں نے مسلسل تین دن اور تین رات تک آنکھ میں نیند کا سرمہ تک نہیں لگایا اور جب یہ اطمینان حاصل کر لیا کہ لوگوں کی عمومی رائے حضرت عثمانؓ کے حق میں ہے تو انہیں خلیفہ نامز کرنے کا اعلان کر دیا۔

(۴) خلیفہ کے انتقال کے وقت جو ارباب شوریٰ یا اہل حل وعقد موجود ہوں' وہ نئے خلیفہ کا انتخاب کر لیں' جیسا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ میں موجود اصحاب شوریٰ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ منتخب کر لیا تھا۔

(۵) مخصوص حالات میں خلافت کی اہلیت رکھنے والے کوئی صاحب طاقت کے بل پر اقتدار حاصل کر لیں اور امت انہیں قبول کر لے جیسا کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد امت نے قبول کر لیا تھا اور وہ اس کے بعد کم وبیش بیس برس تک امت کے متفقہ امیر المومنین رہے۔

خلافت کے انعقاد یعنی کسی اسلامی حکومت کی تشکیل اور اس کے جواز کی یہ پانچ صورتیں فقہائے اسلام نے بیان فرمائی ہیں' ان میں سے دوسری' تیسری اور چوتھی صورت تو آج کے دور میں قابل عمل نہیں ہیں' اس لیے کہ اس وقت دنیا میں کوئی شرعی خلیفہ موجود نہیں ہے جو کسی کو اپنا جانشین نامزد کر سکے یا اس کے لیے کوئی پینل مقرر کر سکے اور نہ ہی خلافت کی کوئی باضابطہ شوریٰ موجود ہے' جس کے ارکان خلیفہ کا انتخاب کر سکیں' اس لیے کہ آج کے عالمی حالات میں خلافت کے انعقاد یا ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کے دو ہی راستے ممکن اور قابل عمل ہیں۔ ایک یہ کہ کسی

ملک کے عوام براہ راست یا اپنے معتمد نمائندوں (ارباب حل وعق) کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب کریں اور دوسرا یہ کہ خلافت کی اہلیت رکھنے والا کوئی شخص طاقت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کر لے اور ملک کے عوام اسے بطور حکمران قبول کر لیں یعنی عملاً اس کی رٹ قائم ہو جائے۔

خلافت یا اسلامی حکومت کے حوالہ سے اہل سنت اور اہل تشیع کے اختلاف کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ اہل سنت کے ہاں یہ نظام ”خلافت“ کہلاتا ہے جبکہ اہل تشیع اسے ”امامت“ سے تعبیر کرتے ہیں اور خلافت وامامت میں چند اصولی اور بنیادی فرق پائے جاتے ہیں:

☆ امام نامزد ہوتا ہے اور خلیفہ امت کی صوابدید پر منتخب ہوتا ہے جیسا کہ اہل تشیع کے نزدیک جناب نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا‘ جبکہ اہل سنت کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام طبقات نے باہمی مشاورت اور اتفاق رائے سے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب کیا تھا۔

☆ اہل تشیع کے نزدیک ”امام“ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے‘ اسی لیے وہ معصوم ہوتا ہے‘ مگر خلیفہ احکام اسلامی کے نفاذ اور حق حکمرانی استعمال کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ جناب نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتا ہے۔ قاضی ابویعلی نے ”الاحکام السلطانیۃ“ میں واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضرت ابوبکرؓ کو ”یا خلیفۃ اللہ“ کہہ کر خطاب کیا تو حضرت صدیق اکبر نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا ”لست بخلیفة الله انا خلیفة رسول الله“ میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ امام اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے خود دلیل کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے‘ مگر خلیفہ جناب نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے اپنے فیصلے اور حکم میں قرآن وسنت کی دلیل کا پابند ہے جیسا کہ صدیق اکبرؓ نے خلات کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبے میں یہ واضح کر دیا تھا کہ میں اگر قرآن وسنت کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر ضروری ہے اور اگر اس کے خلاف چلنے لگوں تو تم پر میری اطاعت ضروری نہیں ہے۔

☆ اہل تشیع کے ہاں امام نسبی اور خاندانی ہے جیسا کہ اہل تشیع کے بارہ امام ایک ہی نسب اور خاندان سے ہیں مگر خلافت نسبی اور خاندانی نہیں ہے، اس لیے کہ چاروں خلفائے راشدین حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد صحابہ کرام کے دور میں بننے والے مسلمانوں کے متفقہ امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ میں سے کوئی بزرگ بھی ایک دوسرے کا نسبی اور خاندانی وارث نہیں تھا، اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی خلافت اکثر خاندانی دائروں میں ہی چلتی آ رہی ہے لیکن حضرات صحابہ کرام کے دور کا نظام خلافت جو آئیڈیل اور اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے، خاندانی اور نسبی خلافت کے دائرہ سے ہٹ کر تھا۔

امام کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا مگر خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پہلے خطبہ میں فرمایا تھا کہ اگر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو لیکن اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو، یہ خلیفہ کا عوام کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اور عوام کا حق احتساب ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں عملی طور پر موجود رہا ہے۔

☆ امام معصوم عن الخطاء ہے اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا مگر خلیفہ کی شرعی حیثیت مجتہد کی ہے جس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ المجتہد یخطئ ویصیب اس لیے حضرات خلفاء راشدینؓ کے بہت سے فیصلوں سے ان کے سامنے اختلاف کیا جاتا تھا اور وہ درست ہونے کی صورت میں اختلاف کو قبول بھی کرتے تھے۔

دورِ حاضر میں ایران کا دستور ''امامت'' کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے کہ امام غائب کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے ''ولایت فقیہ'' کو ان کے نمائندوں کی حیثیت دی گئی ہے اور ولایت فقیہ کے طور پر آیت اللہ خمینی اور ان کے بعد آیت اللہ خامنائی اس منصب پر فائز ہوئے ہیں، ان کے ساتھ ایک ''شوریٰ نگہبان'' ہے اور ولایت فقیہ اور شوریٰ نگہبان کو دستوری طور پر یہ حیثیت حاصل ہے کہ ان کے فیصلے حکومت، پارلیمنٹ، عدالت اور دیگر تمام شعبوں پر بالادستی رکھتے ہیں، وہ ان میں سے کسی کا فیصلہ بھی منسوخ کر سکتے ہیں، مگر ان کے فیصلے کو کسی جگہ چیلنج نہیں کیا جا سکتا،

حکومت اور پارلیمنٹ وقفہ وقفہ سے منتخب ہوتی ہیں مگر ”ولایت فقیہ“ کا منصب تاحیات ہے۔

جبکہ سعودی عرب اور پاکستان کے دستور ”خلافت“ کے تصور کے قریب ہیں، سعودی عرب میں حاکمیتِ اعلیٰ قرآن وسنت کی ہے، حقِ حکمرانی آل سعود کو حاصل ہے مگر وہ قرآن وسنت کے مطابق حکومت کرنے کے پابند ہیں، پاکستان کے دستور میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے، حق حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے اور حکومت اور پارلیمنٹ دونوں دستوری طور پر قرآن وسنت کے پابند ہیں۔

دفعہ نمبر ۵۲ میں ”معیاری زندگی“ اور ”معاشی تحفظ“ کے حوالہ سے بات کی گئی ہے، اس لیے اس حوالہ سے کچھ معروضات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

☆ معیار زندگی کے بارے میں یہ بات سامنے رہنا ضروری ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے بعد جب سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو اصحابِ شوریٰ نے دو اصولی فیصلے کیے، ایک یہ کہ چونکہ خلیفہ کے اوقات امورِ حکومت میں صرف ہوں گے اور وہ اپنا کوئی کاروبار وغیرہ نہیں کر سکیں گے، اس لیے ان کے اور ان کے گھر کے اخراجات بیت المال کے ذمہ ہوں گے۔ اور دوسرا فیصلہ یہ کہ ان کے اخراجات کا تعین اس بنیاد پر ہوگا کہ وہ مدینہ منورہ کے ایک عام شہری کے معیار کے مطابق اپنے گھر کے اخراجات چلا سکیں، عام شہری سے مراد متوسط درجے کا شہری ہے اور فیصلے کے الفاظ میں یہ جملہ بہت زیادہ توجہ کا مستحق ہے کہ **”لاوکس فیھا ولا شطط“**۔ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں حکمرانوں اور عام شہریوں کا معیار زندگی یکساں ہونا چاہیے اور اسی بنیاد پر ”بیت المال“ سے حضرت صدیق اکبرؓ کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

☆ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے سرکاری عمال پر پابندی لگا دی تھی کہ (۱) وہ اپنے گھر کے سامنے ڈیوڑھی نہیں بنا سکیں گے۔ (۲) ترکی گھوڑے پر سواری نہیں کریں گے۔ (۳) باریک لباس نہیں پہنیں گے اور (۴) چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائیں گے۔ یہ اس دور میں معاشرتی

امتیاز کی علامات تھیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمران طبقات کو عام شہریوں کے ساتھ معاشی برابری کے ساتھ معاشرتی برابری کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔

☆ بیت المال سے عام لوگوں کے وظیفے مقرر کرنے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے تھی کہ وہ برابری کی بنیاد پر ہونے چاہئیں، دینی درجات یا فضیلت کو وجہ ترجیح نہیں بننا چاہیے۔ جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ فضیلت اور درجات کے لحاظ سے وظائف کی درجہ بندی ہونی چاہیے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے دور میں وظائف کی تقسیم بالکل برابری کی بنیاد کی ہے مگر حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ طریقہ تبدیل کر کے درجہ بندی کر دی اور امہات المؤمنین، مہاجرین، انصار اور دیگر حوالوں سے مختلف گریڈ طے کر کے اُن کی بنیاد پر وظائف تقسیم کیے۔ مگر امام ابو یوسفؒ نے ”کتاب الخراج“ میں لکھا ہے کہ آخری سال حضرت عمرؓ نے اس درجہ بندی کے معاشرتی نقصانات دیکھتے ہوئے یہ فرمایا کہ مجھے یہ بات سمجھ آئی ہے کہ اس کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے درست تھی۔ اس لیے اگلے سال سے اس کے مطابق عمل کروں گا۔ مگر اگلے سال سے پہلے حضرت عمرؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آ گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں معاشرتی طبقات اور درجہ بندی کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور معاشری یکسانیت قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

بیت المال جناب نبی اکرم ﷺ کے دور میں ہی موجود تھا اور اس کے ذریعہ معاشرہ کے معذور اور ضرورت مند افراد کی مدد کی جاتی تھی، جناب نبی اکرم ﷺ بیت المال کی رقوم سے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے تھے اور تاوان میں پھنس جانے

والے حضرات کی مدد بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک روایت میں مقتول کی دیت بھی بیت المال سے ادا کرنے کا ذکر ملتا ہے، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "**من ترک مالاً فللورثته ومن ترک کلاً وعیالاً فلی وعلی**"۔ جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ اس کے وارثوں کو ملے گا اور جو بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کرے گا اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ میری طالب علمانہ رائے میں بیت المال کے ذریعہ سوسائٹی کے معذور، نادار، بے روزگار ضرورت مند اور بوجھ تلے دبے لوگوں کی مدد کرنے اور ان کی کفالت کرنے کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کے اسی ارشاد گرامی فلی وعلی پر ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے بیت المال کے نظام کو اس قدر منظم کیا کہ خلافتِ راشدہ کا دور آج بھی ویلفیئر سٹیٹ اور رفاہی ریاست کے لیے آئیڈیل تصور کیا جاتا ہے اور بہت سے مغربی ممالک اس کے بعض حصول کی پیروی کر رہے ہیں، حتیٰ کہ ناروے میں اس سلسلہ کے بعض قوانین اور وظیفے حضرت عمرؓ کے نام سے رائج کیے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست صحیح معنوں میں ایک فلاحی ریاست ہے جو مملکت کے تمام باشندوں کی ضروریات زندگی فراہم کرنے اور ان کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کا یہ تاریخی جملہ ایک راہ نما اصول کا درج رکھتا ہے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے پر کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

ایک اسلامی رفاہی ریاست میں بیت المال کا کردار کیا ہے، اس کے حوالے سے

امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور کا ایک واقعہ امام ابو عبید قاسم بن سلام نے ’’کتاب الاموال‘‘ میں بیان فرمایا ہے جو ایک اسلامی ریاست کے رفاہی پہلو کی وضاحت کرتا ہے۔ ان کے دور میں عراق کے گورنر عبد الحمید نے امیر المؤمنین کو خط لکھا کہ اس سال صوبہ میں بیت المال کو جو آمدنی ہوئی ہے اس سے سال بھر کے اخراجات پورے کرنے کے بعد کچھ رقم بچ گئی ہے اس کے بارے میں فرمائیں کہ کیا کیا جائے؟ امیر المؤمنین نے جواب دیا کہ صوبے میں اعلان کر کے جو حضرات مقروض ہیں اور اپنے قرضے ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان کے قرضے بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنر کا جواب آیا کہ یہ کام کر چکا ہوں، اس کے باوجود زائد رقم موجود ہے۔ امیر المؤمنین کا دوسرا خط آیا کہ سروے کر کے معلوم کرو جو لڑکے اور لڑکیاں شادی کے قابل ہیں اور اخراجات میسر نہ ہونے کی وجہ سے شادیاں نہیں کر سکتے، ان کی شادیاں بیت المال کی طرف سے کرا دو۔ گورنر صاحب نے لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں، رقم پھر بھی بچ گئی ہے۔ امیر المؤمنین نے لکھا کہ وہ شادی شدہ حضرات جو بیوی کا مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان کے مہر بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنر عبد الحمید نے لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں، امیر المؤمنین نے پھر لکھا کہ بے آباد زمینوں کا سروے کرا کے انہیں آباد کرنے کے لیے زمین داروں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔

یہ بظاہر عجیب سی لگتی ہے لیکن تاریخی حقیقت ہے اور ایک اسلامی ریاست میں بیت المال کے کردار کی وضاحت کرتی ہے، ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اسلام کے سنہری اصول اور خلافتِ راشدہ اور خلافتِ اسلامیہ کی یہ زرّیں روایات رفاہی ریاست کے حوالہ سے غیر مسلم حکومتوں کی توجہ تو حاصل کر رہی ہیں لیکن مسلم ممالک بالخصوص اسلام کے نام پر

قائم ہونے والی ریاست ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے حکمرانوں کی اس طرف توجہ نہیں ہے۔

دفعہ نمبر 25 کی دوسری شق میں زچہ اور بچہ کی امداد کے حوالہ سے بات کی گئی ہے اور یہ وضاحت کی گئی ہے کہ بچہ شادی کے نتیجے میں پیدا ہو یا بغیر شادی کے' دونوں صورتوں میں یکساں سلوک کا مستحق ہوگا۔ ہمیں بچے کے بارے میں تو کوئی کلام نہیں ہے کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک درست طرز عمل نہیں ہے' لیکن زچہ کے بارے میں دونوں صورتوں میں برابر کے سلوک کی بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بغیر شادی کے بچوں کی صورتوں میں بھی زچہ کو قانونی طور پر برابر کے سلوک کا حقدار قرار دیا جا رہا ہے جبکہ اسلام ان دونوں صورتوں میں فرق کرتا ہے اور شادی کے بغیر بچے کو جنم دینے والی زچہ اور اس کے ساتھ ناجائز تعلق قائم کرنے والا مرد دونوں اسلام کی نظر میں مجرم ہیں اور ان کے لیے سزا مقرر ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک عورت آئی کہ اس نے زنا کیا ہے اور زنا سے پیدا ہونے والا بچہ اس کی گود میں ہے' اس لیے اسے سزا دی جائے' نبی اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ بچے کا تو کوئی قصور نہیں ہے' جاؤ بچے کو دودھ پلاؤ' جب اس کو تمہارے دودھ کی ضرورت نہیں رہے گی تو پھر آنا۔ روایت میں ہے کہ وہ ایک عرصے کے بعد بچے کو لے کر آئی جس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا اور وہ اسے کھا رہا تھا' اس نے کہا کہ اب یہ بچہ روٹی کھا لیتا ہے اور اسے میرے دودھ کی

ضرورت نہیں رہی‘ اس لیے اب مجھ پر سزا نافذ کی جائے‘ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اس عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کو تحفظ فراہم کیا ہے اور اس کے تحفظ کی حد تک اس کی ماں کو بھی سہولت دی ہے لیکن اس ماں کے جرم کو معاف نہیں کیا اور اسے سزا دی ہے‘ اس لیے زچہ بچہ دونوں کے لیے یکساں معاشرتی تحفظ کی بات اسلامی نقطہ نظر سے درست نہیں ہے۔

دفعہ نمبر 30 اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ اس میں اقوامِ متحدہ کے رکن ممالک و اقوام کو اس بات کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ہر حال میں اس منشور کی پابندی کریں گے اور اس منشور میں بیان کردہ آزادیوں اور حقوق کی کوئی ایسی تعبیر بھی نہیں کر سکیں گے جو اس منشور کے مرتب کرنے والوں کے مقصد اور منشا کے خلاف ہو۔

ہم نے انسانی حقوق کے اس منشور کی مختلف دفعات پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف اس پہلو کو سامنے رکھا ہے کہ ان اہم باتوں کی نشاندہی ہو جائے جو ہماری طالب علمانہ رائے میں اسلامی تعلیمات کی رو سے محل نظر ہیں اور جنہیں من و عن قبول کرنا قرآن و سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ باقی رہیں یہ تفصیلات کہ ان پر دلائل اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں مدلل بحث کی جائے‘ یہ کام ہمارے علمی مراکز اور دینی اداروں کا ہے۔ اللہ کرے کہ ہمارے علمی و دینی مراکز اس کی طرف مناسب توجہ دے سکیں‘ آمین یارب العالمین۔